R. No. 2100/57 — Regd. No. L273

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۴۔ شمارہ ۱۵	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۱۵ اپریل ۱۹۶۴ء

اداریہ

اترپردیش کی نئی ریاستی شاخ سے

اترپردیش کی ریاستی شاخ کے نئے انتخابات ۲۹ مارچ کو ہوئے۔ اتفاقِ رائے سے پنڈت آنند نرائن مُلّا کو صدر اور قاضی مختار احمد کو جنرل سکریٹری چُنا گیا۔ جب ریاستی شاخ کا پہلا انتخاب ہوا تھا تو پنڈت کشن پرشاد کول کو صدر اور حیات اللہ انصاری کو جنرل سکریٹری بنایا گیا تھا۔ کول صاحب نے اترپردیش میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جو کوششیں کیں انھیں اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر چُنے گئے۔ مسعود صاحب اردو کے چوٹی کے محقق اور معلم ہیں۔ ان کا ہماری ادبی دنیا میں بڑا درجہ ہے۔ مگر انھوں نے اردو زبان کی بھی نمایاں خدمت کی ہے۔ حیات اللہ انصاری دستخطی مہم کے روحِ رواں تھے اور انھوں نے اس کے لئے ایک مثالی تنظیم قائم کی تھی۔ وہ برابر اردو کی بقا اور ترقی کے لئے سینہ سپر رہے ہیں۔ انھوں نے اور ان کی بیگم سلطانہ حیات نے اترپردیش میں اردو کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ نئے عہدہ داروں کو مسعود صاحب اور حیات اللہ صاحب سے پورا تعاون ملے گا اور اترپردیش میں اردو کے حقوق کے لئے جد و جہد اور تیز ہوسکے گی۔

پنڈت آنند نرائن مُلّا اردو کے چوٹی کے شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے سہ لسانی فارمولا کنونشن میں جو خطبہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں پڑھا تھا اس کو ساری اردو دنیا نے سراہا۔ اس میں اردو کی پوزیشن نہایت خوبی سے بیان کی گئی تھی اور اردو کے ساتھ ناانصافیوں کی نہایت واضح تصویر پیش کی گئی تھی۔ اس خطبے میں جوش بھی تھا اور ہوش بھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس خطبے نے مایوس دلوں میں امید کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ ہماری یہ توقع بے جا نہیں کہ انکی قیادت میں اترپردیش کی ریاستی شاخ اور باعمل اور سرگرم کار ہوگی۔ اس کی مقامی شاخوں کی تعداد بڑھے گی اور اس کی تنظیم اور مضبوط ہوگی۔ حسن اتفاق سے ریاستی شاخ کے نئے جنرل سکریٹری قاضی مختار احمد ایک تجربہ کار قومی کارکن ہیں۔ انھوں نے کانپور کی کل ہند کانفرنس کا سارا انتظام کیا تھا۔ وہ عملی آدمی ہیں اور امید ہے کہ ان کی محنت اور کوشش سے عملی میدان میں انجمن اور مستعد اور فعال ثابت ہوگی۔

اترپردیش نہ صرف ہندوستان کا دل ہے بلکہ اردو کا گھر بھی ہے۔ یہاں ذہانت و قابلیت کی کمی نہیں مگر یہاں کے لوگوں کی ساری قابلیت ایک دوسرے پر اعتراض کرنے میں صرف ہوجاتی ہے۔ اترپردیش کی تہذیب پر ہم سب بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ مگر آزادی کے بعد اس ریاست نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی اسے کرنی چاہیے تھی۔ اردو کے ساتھ سب سے زیادہ زیادتی بھی اسی صوبے میں ہوئی ہے۔

اس اشاعت میں

اس زیادتی کی ذمہ داری تو بڑی حد تک یہاں کی حکومت اور اکثریت پر ہے جس نے ہندی سے محبت کے معنی یہ لئے ہیں کہ اردو کو اس کے جائز حقوق سے محروم کر دیا جائے مگر اس صورت حال میں اترپردیش کے اردو دوستوں کی بے حسی اور بے عملی اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی عادت بھی شریک ہے۔ بہار کی ریاست میں مقامی شاخوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ اترپردیش میں تین چالیس شاخیں ہیں۔ بہار کے اردو دوستوں کے کارنامے کا اندازہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اترپردیش کے اردو دوست کانفرنسوں اور جلسوں کے بہت شوقین ہیں، ٹھوس اور عملی کاموں میں اُن کا دل نہیں لگتا۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں افسروں کی طرف سے بڑی رکاوٹیں ہیں، مگر مقامی کارکن اگر ہمت اور استقلال کا ثبوت دیں تو بڑی حد تک ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ دینی تعلیمی بورڈ نے تھوڑے عرصے میں خاصی تعداد میں اپنے ابتدائی اسکول قائم کر لئے۔ انجمن کی شاخیں ایسا کیوں نہیں کر سکتیں۔ اترپردیش میں سب شاعر ہیں، سب ادیب ہیں، سب نقاد ہیں۔ یہ سب چاہتے ہیں کہ اردو کی کتابیں اُن کو نذر کی جائیں۔ یہ کتابیں خریدنا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ اردو کے اخبار کو منہ نہیں لگاتے۔ یہ اردو کو گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔ ابتدائی درجوں میں اس کی تعلیم کے لئے جد و جہد ضروری نہیں سمجھتے۔ ہندی تو خیر لازمی ہے اور اس میں مہارت تو حاصل کرنی چاہیے۔ ان کے نزدیک انگریزی بھی ضروری ہے، سائنس بھی ضروری ہے، دوسرے مضامین بھی ضروری ہیں، صرف اردو غیر ضروری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اترپردیش میں اردو کے ساتھ جس حد تک ظلم حکومت یا اکثریت نے کیا ہے اُس سے کم اردو دوستوں نے نہیں کیا۔ وہ اردو کی خاطر ذرا سی قربانی نہیں کر سکتے، ذرا سی تکلیف نہیں گوارا کر سکتے، ذرا سا سرمایہ نہیں جمع کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہماری قومی اور جمہوری حکومت کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور جب تک وہ ایسا نہیں کرتی ہمیں اس سے مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثریت کو بھی فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہیے اور ہم اس سے اس کی بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں۔ اردو اترپردیش کی زندگی میں اس کی تاریخ اور تہذیب میں، اس کے مزاج اور کردار میں جو درجہ رکھتی ہے اس کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اترپردیش کی ذہنی ترقی اور خوشحالی اور اس کی عظمت و رفعت کا ہر تصور اردو کیلئے مناسب جگہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔ مگر یہاں کے اردو دوستوں کو بھی اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یہ فرض جلسوں اور تقریروں سے ادا نہیں ہوگا، اخباروں میں حکومت اور اکثریت کو کوسنے سے بھی نہیں۔ اس کے لئے خود ہم کو اپنی تنظیم مکمل کر کے ہر شخص سے اُس کی صلاحیت کے مطابق کام لے کر، ہر قصبے، شہر اور ضلع میں اردو کی تعلیم کا انتظام کر کے، انجمن کی شاخوں کو فعّال بنا کر، اردو تحریک کو قومی نقطۂ نظر سے چلا کر، تمام سیکولر پارٹیوں کا تعاون حاصل کر کے، ہندی کے ادیبوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ اترپردیش کی نئی ریاستی شاخ سے ہمیں بڑی توقعات ہیں۔ اس کے پیچھے ٹھوس کام کی ایک نمایاں تاریخ ہے۔ اب اُسے اپنے کام کی رفتار کو بہت تیز کرنا ہے اور اردو کے سارے حقوق کو منوانا ہے۔

بہترین مضامین پر عطیہ

حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ دیوہ شریف بارہ بنکی نے دو عنوانات تجویز کئے ہیں اور ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی دعوت عام دی ہے۔ سب سے بہتر مقالے پر انعام دینا تجویز کیا ہے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں۔

پہلا مضمون:

"حضرت حاجی سید وارث علی شاہ صاحب قبلہ کی حیاتِ پاک، تعلیمات و ارشادات پر لکھا جائے گا۔"

دوسرا مضمون:

"دیوہ شریف کی روحانی اور علمی تاریخ پر ہوگا۔"

ہر دو مضامین میں آٹھ ہزار الفاظ سے کم نہ ہوں۔ یہ مضامین ٹرسٹ کمیٹی کے مقرر کئے ہوئے ججوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ سب سے بہتر مضمون انعام کا مستحق قرار پائیگا اور اس سلسلے میں ججوں کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔ جن مضامین پر انعام دیا جائیگا وہ ٹرسٹ کمیٹی کی ملکیت ہونگے اور ان کے جملہ حقوق بنام ٹرسٹ محفوظ ہونگے اور بقیہ کے واپسی کی ذمہ داری ٹرسٹ پر نہ ہوگی۔ دونوں موضوعات پر سب سے بہتر قرار دئے گئے مضمون پر ڈھائی ڈھائی سو کے نقد انعامات دئے جائیں گے۔

مضامین لکھنے کے لئے جو حضرات دیوہ شریف آکر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے اُن کے قیام و طعام کا انتظام ٹرسٹ کی طرف سے کیا جائیگا۔

دونوں موضوعات پر مضامین بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء ہوگی اور رضی احمد صاحب آنریری منیجر حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ دیوہ شریف کے پاس داخل ہوں گے۔

ڈاک سے بھیجنے والے مضامین رجسٹرڈ بھیجے جائیں تو مناسب ہوگا۔ مضامین صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھے جائیں گے۔

ڈاکٹر عبد العلیم نامی

اُردو کی نئی مطبوعات

اُردو کی علمی و ادبی پوزیشن اور اُس کے جمالیاتی ماحول میں بہت کم فرق آیا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے عوام و خواص اُسے جس نظر سے دیکھتے تھے آج اُس سے بھی زیادہ اس کی قدر افزائی کرتے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ اُردو زبان کی چاشنی اپنی تمام فطری رعنائیوں کے ساتھ دلنواز رہے گی۔

اگر یہ امر مسلّم ہے کہ زبانیں بنتی ہیں بنائی نہیں جاتیں تو اُردو زبان بھی بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بن رہی ہے۔ سفر کی دشواریاں جب ہر فرد اور قوم کی راہ کا کانٹا بنتی ہیں تو اُردو زبان کی ترقی ہی کا سوال کیوں زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد اپنے خطبات عالیہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"اے بے خبر یاد رکھ کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لئے ہیں۔ ایک بے روح لاش کے لئے نہیں ہیں۔ آرام کی خواہش ہے تو اُس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے۔ بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی پھر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضروری ہیں۔"

اُردو کو ایک عالمگیر اور مشرق کی سب سے بڑی زبان بنانے کے لئے ٹھوکریں کھلانا ضروری ہے۔ آج اُردو کس منزل پر پہنچ گئی ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو اُس کے پھلتے پھولتے ادب پر ایک نظرِ عمیق رکھتے ہیں۔ آپ اُس کے ادب کی طرف دیکھئے۔ اُس کی تنقید اور انشاء پر نظر ڈالئے۔ تذکرے، تاریخ اور سوانح ملاحظہ فرمائیے۔ اس کا فلسفہ اور نفسیات پڑھئے۔ تفسیر، حدیث اور تصوّف کا مطالعہ کیجئے، غرض کہ جس میدان میں چاہئے عقل و فراست کے گھوڑے دوڑا لیجئے۔ خواہ وہ تھیٹر، اسٹیج اور ڈرامہ کا میدان ہو یا لغات، محاورات، قواعد اور صرف و نحو کا۔ آپ دیکھیں گے کہ اُردو ادب ایک نئی کروٹ بدل رہا ہے۔

آیئے میرے ساتھ آیئے۔ یہ ہمارا ادبی میدان ہے اور اس میں آپ کو اس قدر شعری مجموعے ملیں گے کہ سال بھر تک مطالعہ کرنے کے بعد بھی آپ کو وقت کی تہی دامانی کا شکوہ کرنا پڑے گا۔ "وادیٔ گل" ہے رفعت سروش کی نظمیں۔ "پرتو" ہے۔ وامق سلیم احمد کا مجموعہ کلام۔ یہ شفیق جونپوری کی تخلیق "بیانہ" ہے۔ یہ سکندر علی وجد کے "اوراقِ مصوّر" ہیں۔ یہ شارق میرٹھی کا "بادۂ جام" ہے اور یہ "صبحِ غزل" ہے شعری اجوبالی کا رنگا رنگی کلام۔ یہ اعظم گونڈوی کی غزلوں کا تازہ ترین گلدستہ "رنگ و بو" ہے۔

اب آپ ناول اور افسانہ کی طرف دیکھئے۔ آپ کو ایک دریائے بے پایاں ٹھاٹھیں لیتا ہوا نظر آئے گا اور انتخاب مشکل ہو جائے گا کہ کیا پڑھا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ دیکھئے۔ یہ ہاجرہ نازلی کا "غمِ دوراں" اور یہ اُن کا دوسرا ناول "شبینہ" ہے۔ یہ رضیہ سجاد ظہیر کا "سُمن" ہے۔ یہ زبیدہ خاتون کا "دو سال پہلے ـــ دو سال بعد" ہے۔ یہ صالحہ عابد حسین کا "راہِ عمل" ہے جو ایک خاصے کی چیز ہے۔ ملک راج آنند کے "سات سال"۔ احمد شجاع کا "ننگا شہر"۔ ضیاء عظیم آبادی کا "بجھائے نہ بجھے" اور اُن کا دوسرا ناول "پھولوں کی سیج" ہے۔ اور یہ سب اس قدر دلچسپ، مفید اور کارآمد ہیں کہ آپ بغیر پڑھے نہیں رہیں گے۔ افسانہ کی دنیا بھی بہت وسیع ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا "دانہ و دام"۔ رام لعل کا "آواز تو پہچانو"۔ "بشیشر پرشاد" منور لکھنوی؟ کا "جل اور دھواں"۔ جیلانی بانو کا "نروان" اور ہاجرہ مسرور کا "ہائے اللہ" ایسے افسانے ہیں جن کو پڑھے بغیر آپ کو نیند نہیں آئیگی۔

ڈرامے کی طرف البتہ کم توجہ دی گئی ہے پھر بھی کرتار سنگھ دُگل کا "اوپر کی منزل"۔ کرشن چندر کا "دروازے کھول دو"۔ جیالال ساز کا "موت پر فتح"۔ ساغر نظامی کا منظوم "شکنتلا" اور ٹیگور کے تین نئے ترجمے اُردو کی ناٹکی دنیا پر بہت اثر پذیر ہوئے ہیں۔

ادب اور انشاء پر بھی کافی کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً غمازے سخن۔ بازیافت۔ ادب کا مطالعہ۔ فرانسیسی ادب۔ فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ۔ ویدی ادب۔ انشاء اللہ خاں انشاء۔ مرزا مظہر علی جانِ جاناں۔ پھر علمی و ادبی کتابوں کا سلسلہ ایک بحرِ بیکراں کی طرح پھیلتا چلا گیا ہے۔ اُردو تنقید پر بھی اچھی اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں مثلاً اُردو تنقید کا ارتقاء۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ نئے تنقیدی گوشے۔ عکس اور آئینے وغیرہ وغیرہ۔ جدید ادب کے علاوہ اُردو کا کلاسیکی ادب بھی

بڑی سرعت کے ساتھ طباعت کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، پیارے لال آشوب، نہال چند لاہوری، مرزا جان طپش، محمد بخش مہجور، میر شیر علی افسوس، الطاف حسین حالی، سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا، نواب میرزا خاں داغ دہلوی، کی تصانیف اعلیٰ کاغذ، معیاری کتابت، دیدہ زیب طباعت اور رنگین جیکٹوں میں ضروری حاشیے اور فٹ نوٹ کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔

اُردو ادب نے گزشتہ چند ماہ میں جس قدر ادب پیدا کیا ہے اُس کا مجمل ذکر بھی طبعِ نازک کو ناگوار گزرے گا اس لئے صرف چند ادبی شہ پاروں ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

لیجئے۔ یہ "عملی تنقید" ہے۔ اس کے مصنف کلیم الدین احمد ہیں۔ پروفیسر مذکور کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اُردو ادب کے تمام موجودہ سرمایے کو عملی تنقید کے تحت لاکر اُس کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور اس منصوبے کے تحت اس سلسلے کو تین حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اول نظم سے متعلق ہے اور تین جلدوں پر تقسیم ہے۔ حصّہ دوم نثر ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ سوم اُصول تنقید سے متعلق ہے۔

حصّہ اوّل میں شعر و غزل پر بحث ہے اور ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر مذکور نے اس میں درجنوں اقتباسات دیے ہیں اور ان پر طویل بحث کی ہے لیکن ہر جگہ نتائج اخذ کرنے میں اس قدر کامیاب نظر نہیں آتے جس قدر کہ اُن سے امید کی جاتی ہے۔ ایک انتخاب میں وہ لکھتے ہیں کہ "غزل کے اشعار جواہرات کے ایک ہار کی طرح ہیں، جس میں اپنی اپنی جگہ تمام ہیرے جگمگاتے ہیں اور اگر کوئی ہیرا اوروں سے تابندہ اور درخشاں ہے تو اسے بیت الغزل سمجھ لیجئے"۔ پروفیسر مذکور یہ لکھ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ "یہ اُردو والوں کی سہل نگاری ہے کہ وہ نظم پر شعر کو ترجیح دیتے ہیں اور تنقید کے بدلے واہ واہ سبحان اللہ سے اپنی تسکین کر لیتے ہیں"۔

ہماری دوسری کتاب کرشن چندر کا نیا ڈراما "دروازے کھول دو" ہے جو جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب نما اس پر تبصرہ کرتے ہوا لکھتا ہے:۔

"آزادی کی دولت سے مالامال ہونے اور ملک کی فضا کو لطیف و خوش آیند بنانے کے لئے "قومی یک جہتی" کی تحریک اور اس کی تبلیغ ضروری ہے۔ کرشن چندر بھی اس میدان میں آگے آئے اور ایک ڈراما لکھا جو اُن کے عقائد اور خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

"دروازے کھول دو" کا پلاٹ بہت سیدھا اور عام فہم ہے۔ اس کے کردار ہندوستان کے متعدد فرقوں اور بہت سے صوبوں کے افراد اور باشندے ہیں۔ ہر کردار خواہ وہ چند لمحوں کے لئے اسٹیج پر آئے، وہ اپنا ایک خاص اثر اور کیفیت چھوڑ کر جاتا ہے۔ مکالمے نہ صرف برجستہ، برمحل اور طنز و مزاح سے بھرپور ہیں بلکہ ان کے اندر حقیقت کی عکاسی اور واقعیت کی جھلک اور لکھنے والے کی چابک دستی اور خلوص نیت بھی جلوہ گر ہے۔

یہ ایک ایکٹ کا ڈراما ہے اور اس میں ایک ہی سٹ ہے جس پر مختلف قسم کے کردار آتے اور گزر جاتے ہیں لیکن ربط اور تسلسل میں فرق نہیں آتا کن فلکٹ Conflict اور سسپنس Suspence جو ایک اچھے ڈرامے کے ضروری اجزا ہیں، اس میں بخوبی پائے جاتے ہیں۔ نتیجہ کے لحاظ سے بھی یہ ڈراما خوشگوار اور سبق آموز ہے اور اسی باعث متعدد بار نشر ہو چکا ہے اور درجنوں بار اسکول اور کالج اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے۔

ہماری تیسری کتاب "راہِ عمل" ایک ناول ہے جو صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے اور دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سماج سدھار کی خوبیوں کو اُجاگر کرکے دکھلایا گیا ہے۔ اس ناول کے ہیرو حبیب احمد عرف میاں صاحب ہیں جو کملا نگر کے زمیندار ہوتے ہوئے بھی اپنی بیوی صفیہ بیگم کے ساتھ قومی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صفیہ بیگم عوام میں "آپا" کے نام سے مشہور ہیں اور بڑی دلچسپی سے سماجی کاموں میں حصّہ لیتی اور اپنے بیٹے سلیم اور بہو زہرہ کے ساتھ ایک لڑکی گیتا کی بھی پرورش کرتی ہیں۔ صفیہ بیگم کا کردار بہت خوبی سے پیش کیا گیا ہے اور ناول اس قابل ہے کہ طالبات ثانوی اسکولس اسے بغور پڑھیں اور قومی و ملکی خدمت اور سماج سدھار کی اسپرٹ پیدا کریں۔

(باقی صفحہ ۷ پر)

کرشن موہن

عشقِ بتاں

غم گسار مزاجِ عشقِ بتاں — دردِ دل کا علاجِ عشقِ بتاں
لطف آنے لگا ہے جینے میں — دل میں جاگا ہے آج عشقِ بتاں
دے کے دن رات لوک لاج کو مات — دل پہ کرتا ہے راج عشقِ بتاں
باعثِ اضطرابِ قلب و جگر — غمِ دوراں، سماجِ عشقِ بتاں
سہے غم تمام و ننگ مگر — کر نہ پائے احتجاج عشقِ بتاں
کشمکش میں اسیر رکھتے ہیں — سوزِ دل، لوک لاج، عشقِ بتاں
جاہ و مال و منال کیا شے ہیں — چھین لے تخت و تاج عشقِ بتاں

کرشن موہن شبابِ رنگیں سے
لے رہا ہے خراج عشقِ بتاں

اقبال رودولوی

نذرِ فیض

جہاں سے لے کے سکوں ساری کائنات چلی
وہیں سے ہم جو چلے کتنے بے قرار چلے
برس پڑے تھے جہاں آ کے رحمتوں کے سحاب
جدھر سے ہو کے تمہارے گناہگار چلے
رہِ حیات میں جب سخت مرحلے آئے
عجیب آن سے کچھ تیرے جاں نثار چلے
کسی کی یاد کے دل میں چراغ جلنے لگے
ہوائے سرد کے جھونکے جو خوشگوار چلے
وہ جس کے ہجر سے ویراں ہے رہگزارِ حیات
اسی کا ذکر کر چلے اور بار بار چلے
تمہارے غم کی بدولت یہ دل رہا محفوظ
اگرچہ تیر زمانے کے بے شمار چلے
یہی نہ بات تو اقبال صاحبانِ خرد
ہماری وضعِ جنوں کر کے اختیار چلے

نازش انصاری (علیگ)

غزل

آ گئے زنداں میں خود جو دیوانے — آج جی میں ہے کیا خدا جانے
کتنے ظالم حبیب جو زمانہ ساز — آج ہم دوستوں کو پہچانے
جان کر بھی فریب کھاتا ہے — دل کی باتوں کو کوئی کیا جانے
[illegible] دیکھ کے بھی — کھل گئی کیوں کلی خدا جانے

وقت کی بات ہے یہ اے نازش
کل جو اپنے تھے اب ہیں بیگانے

ہند پولینڈ ثقافتی تعاون

(بحوالہ ہندوستان ٹائمز) ہندوستان اور پولینڈ نے دو سال کے لئے متفقہ طور پر ایک سائنسی، ٹیکنیکی اور ثقافتی پروگرام مرتب کیا ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر ایم سی چھاگلا اور پولینڈ کے وزیر ثقافتی امور و فن نے اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے اس پروگرام پر دستخط کئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر پروگرام پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد ہوا تو دونوں ملکوں میں دوستی اور تعاون کے رشتے اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔

سائنسی اور ثقافتی تبادلہ کے سلسلے میں یہ پہلا پروگرام ہے جو ۱۹۵۷ء کے ہندوستان اور پولینڈ کے ثقافتی معاہدہ کے سلسلے میں مرتب کیا گیا ہے۔

اس پروگرام کو آخری شکل دینے والے ہندوستان اور پولینڈ کے مشترکہ کمیشن کا اگلا اجلاس ۱۹۶۶ عیسوی میں وارسا میں ہوگا۔

اس پروگرام کے ماتحت پولینڈ ہندوستان کو کان کنی کی صنعت میں تربیت حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرے گا۔ دھنباد کے ہندوستانی کان کنی کے اسکول میں ایک پروفیسر کا اضافہ کرنے کے علاوہ دس سے بیس تک انجینیر کان کنی کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے پولینڈ بھیجے جائیں گے۔ کیمیکل و الیکٹریکل انجینیرنگ، کان سازی، کوزہ گری اور شیشہ سازی کی صنعتوں میں ایم اے اور ریسرچ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مزید دس ہندوستانی انجینیر پولینڈ بھیجے جائیں گے۔

ان ہندوستانی انجینیروں کو صنعتی اور قومی اقتصادی منصوبہ بندی کی عملی ٹریننگ بھی دی جائے گی۔ پروگرام میں دونوں ملکوں کے منتخبہ سائنسی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے درمیان تبادلہ، برقی طاقت کے کارخانوں، کپڑے اور [illegible] کی صنعتوں میں باہمی تبادلہ اور وارسا یونیورسٹی میں ہندی اور ہندوستانی یونیورسٹی میں پولش زبان کی تعلیم کے لئے لیکچرر کے تقرر کی تجاویز بھی شامل ہیں۔ ثقافتی میدان میں صحافیوں، فلموں، ادبی کارناموں، جدید فن نقاشی، تھیٹریکل تماشوں اور آثارِ قدیمہ کی مطبوعات کا تبادلہ کیا جائے گا۔

بچوں کی کتابوں پر انعام

حکومت ہند نے بچوں کی کتابوں پر فی انعام ایک ہزار روپے کے حساب سے ۱۵ انعامات کا اعلان کیا ہے۔ ہندی میں ۲، سندھی، اردو، آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑی، کشمیری، مرہٹی، ملیالم، اڑیہ، پنجابی، تامل اور تلگو میں ایک ایک انعام مقرر ہے۔ داخلہ کی آخری تاریخ یکم مئی ۱۹۶۲ء ہے۔

نورالحسن ہاشمی

میاں تشنہ

جن لوگوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" پڑھا ہے یا جن لوگوں نے اس کی تمثیل دیکھی ہے ان کو یاد ہوگا کہ باقر علی جعفری کے بعد ایک عجیب قسم کے بزرگ کے غزل پڑھنے کی باری آتی ہے۔ یہ مشاعرے میں ننگ دھڑنگ صرف ایک کمبل ڈالے مزے میں دوزانو بیٹھے جھومتے ہوتے ہیں۔ چوبدار ہچکچاتا ہے کہ ان کے سامنے شمع رکھے یا نہ رکھے۔ مرزا فخرو اشارہ کرتے ہیں کہ شمع رکھیے ان کے سامنے شمع رکھ دی جاتی ہے۔ جب اس کی روشنی آنکھوں پر پڑتی ہے تو یہ بزرگ آنکھیں کھولتے ہیں۔ کچھ سوچ کر پھونک مار کر شمع گل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ عرض کروں۔ سب کہتے ہیں ضرور فرمائیے۔ چنانچہ یہ اپنی غزل کچھ گانے اور کچھ پڑھنے کے انداز میں شروع کر دیتے ہیں۔ غزل کے جو اشعار فرحت اللہ بیگ نے دئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

مرزا فرحت اللہ بیگ آگے لکھتے ہیں کہ "کیا بتاؤں اس غزل کا کیا اثر ہوا، ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مفہوم، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا اُدھر میاں تشنہ زمین جھٹکے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی یہ "کچھ بھی نہیں" "کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی، جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منھ سے یہی کلام نکلا کہ واقعی "کچھ بھی نہیں"۔"

یہ میاں تشنہ کون تھے۔ یہ معلوم ہونے سے قبل ان کی مندرجۂ بالا غزل کے وہ اشعار بھی سن لیجیے جو مرزا صاحب نے غالباً بخوف طوالت منتخب نہیں کئے۔ بقیہ شعر یہ ہیں:۔

کیا کہا، پھر بھی کہو، دل کی خبر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کیا ہے خم گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

جذبۂ دل نے کیا ہائے اثر کچھ بھی نہیں
ہم یہاں مرتے ہیں اور ان کو خبر کچھ بھی نہیں

اک جفا تیری نہیں کچھ بھی مگر ہے سب کچھ
اک وفا میری جو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

"خم خانۂ جاوید" جلد دوم میں میاں تشنہ کا جو کچھ حال لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کا پورا نام مع تخلص منشی محمد علی تشنہ تھا، دہلی کے رہنے والے تھے اور ذوق، غالب اور مومن کے معاصر۔ پہلے استاد ذوق سے اصلاح لیتے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد حکیم آغا جان عیش سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ داغ، ظہیر اور انور دہلوی کے ہم سبق اور ہم صحبت تھے۔ درویش طبع اور وارفتہ مزاج آدمی تھے، کبھی کپڑے پہنتے تھے اور کبھی نہیں، ذہن بڑا رسا پایا تھا اور حافظہ تو ایسا تھا کہ صدہا غزلیں نوک زبان تھیں، اپنا پورا دیوان حفظ تھا، اور یہی نہیں بلکہ دوسروں کا کلام بھی بہت یاد تھا، لیکن بڑا غضب یہ کرتے تھے کہ نشہ کی وجہ سے یا عمداً دوسروں کا کلام بھی اپنے کلام کے ساتھ پڑھ دیتے تھے۔ شراب بکثرت پیتے تھے اور اسی لئے ایک سرخوشی یا خمار کی حالت ہمہ وقت ان پر طاری رہتی تھی۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں دہلی سے باہر نکلے اور میرٹھ، سہارن پور، پٹیالہ، امرت سر، لاہور، ملتان وغیرہ گھوم کر سنہ ۱۲۹۵ھ میں پھر دلی آ گئے تھے۔ سنہ ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ وفات: "تشنہ شراب ابد کا") بعضوں کا خیال ہے کہ پورب میں انتقال کیا۔ لیکن ظہیر دہلوی راوی ہیں کہ پٹیالہ میں وفات پائی، ہرچند کہ یہ اکثر اپنے استاد بھائی داغ دہلوی کے کلام پر ہاتھ صاف کرتے رہتے تھے لیکن ان کے مشاق سخن سنج ہونے میں کلام نہیں، روز مرہ پر اچھا عبور تھا۔ ان کی غزلیں ان کی زندگی ہی میں رائج ہوگئی تھیں اور اکثر ارباب طرب محفلوں اور بازاروں کی رونق ان سے دوبالا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں اکثر بلند پایہ اور عدیم النظیر اشعار پائے جاتے ہیں جس سے ان کا رتبۂ استادی مسلم ہے۔

اس کے بعد "خم خانۂ جاوید" میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا انتخاب بھی دے دیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا کلام کبھی شائع بھی ہوا تھا یا نہیں یا ان کا قلمی دیوان اب کہیں موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں

اکثر بڑے بلند پایہ اور عدیم النظیر اشعار نکل آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب راقم الحروف نے مرزا فرحت کی پیش کی ہوئی سند، جو بالا غزل پڑھی تو فکر ہوئی کہ ان کا کلام کہیں کچھ اور دیکھنے کو مل سکے تو بہتر ہو۔ چنانچہ حال ہی میں اتفاق سے ایک قدیم بیاض دیکھنے کو ملی، صاحب بیاض ریاست بھوپال کا صدر المہام رہ چکا ہے اور سنہ ۱۲۷۲ھ میں بھوپال سے ریاست پٹیالہ بھی جا چکا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غزل اس نے وہیں سُنی ہو۔ چونکہ یہ غزل بھی بہت خوب ہے اس لئے یہاں پوری درج کی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دہلی کے مشاعرے کی ہو۔ کیونکہ غالب اور دیگر مشاہیر کی غزلیں بھی اسی زمین میں موجود ہیں۔

سراسر غم ہی غم ہو دل تو کیونکر دل سے غم نکلے
تمنا ہی تمنا ہو تو پھر کس طرح دم نکلے

قیامت ہے جو دل کی آرزو اک دم کے دم نکلے
قیامت تک تو نکلے گرچہ حسرت کم سے کم نکلے

نہ دل زلفوں سے چھوٹا اور نہ تم زلفیں چھڑانے سے
یہ وہ جنجال ہے جس سے نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا زاہد
کہیں ایسا نہ ہو یاں سے وہی کافر صنم نکلے

نہ اُترا مفلسی میں بھی نشہ دولت کا اے تشنہ
گدائی کو بھی ہم نکلے تو لے کر جام جم نکلے

چوتھا شعر غالب کے یہاں بھی اس غزل میں ملتا ہے جس کا مطلع ہے ؎

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

پہلے شبہ ہوا کہ نہیں معلوم یہ چوتھا شعر واقعی تشنہ کا ہے یا غالب کا، لیکن صاحب "خم خانہ" سے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے) جب یہ معلوم ہوا کہ یہ اپنے کلام کے ساتھ دوسروں کے اشعار بھی پڑھ جاتے تھے۔ تو اطمینان ہو گیا تھا کہ تشنہ صاحب تو وہیں سے سیراب ہوتے ہوں گے۔ مگر اب مالک رام صاحب اور عرشی صاحب کے مرتبہ دواوین غالب سے معلوم ہوا کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے اور اس لئے گمان ہوتا ہے کہ تشنہ کا ہو۔

تیسرا اور پانچواں شعر صاحب خم خانہ نے بھی اپنے انتخاب میں دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ کسی کتب خانہ میں تشنہ کا مکمل دیوان موجود ہو تو ان کے واقعی بلند پایہ اور عدیم النظیر اشعار منتخب کر لئے جائیں تاکہ ہمارے اچھے شعری ادب میں اضافہ ہو سکے۔

آخر میں خم خانہ سے تین شعر اور یہاں تشنہ کے سن لیجئے ؎

جہاں میں ایک تو ہم ہیں کہ تنگ آئے ہیں جینے سے
اور اک خضر و مسیحا ہیں کہ اس جینے پہ مرتے ہیں

الٰہی دیدہ و دل تو نہ ٹھہرے رہ گزر جیسے
کبھی حسرت گزرتی ہے کبھی ارماں گزرتے ہیں

طبیعت کی روانی دیکھنی ہو تو یہاں تشنہ
وہ دریا ہیں کہ جو چڑھتے ہیں پھر دم میں اترتے ہیں

بقیہ: اُردو کی نئی مطبوعات

ہماری چوتھی کتاب "لمعات انور" ہے جو سردار انور خاں انور کے کلام کا مجموعہ ہے۔ سردار انور صاحب ایک اچھے شاعر اور ادیب ہیں، اور ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ تعلیمی خدمات میں صرف ہوا ہے۔ انھوں نے جوان سالی سے پیرانہ سالی تک طبیعت اور مزاج کے جو اُتار چڑھاؤ دیکھے وہ دلکش اور ادبی انداز میں نظم بند کرتے گئے۔ اور اسی ذخیرۂ حیات کا نام "لمعات انور" ہے۔ اس میں ہر وہ موضوع موجود ہیں جن سے اس زندگی میں واسطہ پڑ سکتا ہے۔ سردار انور صاحب کا گمان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدات اور احساسات کو بالکل راست انداز میں قلمبند کر دیا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ ہماری آپ بیتی ہے۔

"لمعات انور" تین حصّوں میں منقسم ہے حصّہ اول میں دو سو سے زیادہ تمام ردیفوں میں پرانی اور نئی کیف آور غزلیں ہیں۔ حصّہ دوم میں "شرار غم" کے ماتحت دل سوز مرثیہ و سلام ہیں۔ "شعاع عید" کے سلسلے میں مسرت افروز عیدیاں ہیں۔ علاوہ ازیں "انوار دو عالم"۔ "چراغان حرم"۔ "روشنی انجمن" اور "بزم انجمن" کی جلی سرخیوں کے ضمن میں مختلف الالوان قومی، اخلاقی، معاشرتی و خانگی موضوعات پر سو سے زیادہ نظمیں جلوہ گر ہیں۔ حصّہ سوم میں سو تاریخی قطعات شادمانی و وفات ہیں۔ نیز مشہور شعرائے کرام کے قطعات تاریخ طبع دیوان منسلک ہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بمبئی)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

مراسلات

اُردو کا شعری سرمایہ دیوناگری رسم الخط میں

آج کل اُردو کے شعری مجموعے ہندی رسم الخط میں چھاپنے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ اُردو ادب کی مقبولیت اور بقا کے لئے آپ اسے ایک اچھی علامت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ناواقفیت یا بے سوچے سمجھے عمل کی صورت میں اچھی باتوں کے بھی بُرے نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ملک میں جو پبلشرز محض پیسہ کمانے کے خیال سے اس طرف رجوع ہوئے ہیں ان کا ذکر ہی نہیں۔ بلکہ جو شاعر اور پبلشرز اُردو ادب کی بقا در ترویج کا اپنے دل میں احترام رکھتے ہیں ان کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے۔

ہندی میں چھپے ہوئے اُردو کے بعض مجموعے دیکھ کر چند دشواریوں کا احساس ہوتا ہے۔

دشواریاں

(۱) تلفظ (۲) واوٗ عاطفہ کا اظہار (۳) زیر کا اعلان (۴) "ے" کا اعلان (۵) ہائے مختفی (ہ) کی صورت۔ (۶) "ے" اور زیر کا فرق (۷) بعض مخصوص لفظوں کی ادائگی۔

ان اشارات کی موجودگی میں چند باتیں قابل توجہ ہیں :-

بعض اُردو حروف کا بدل ہندی میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف حروف کے نیچے نقطے لگا کر آوازیں سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً۔ گ (ग) اور غ = (ग़)

ج (ज) اور (ز۔ذ۔ظ۔ض) = (ज़)

پھ (फ) اور ف = (फ़)

کھ (ख) اور خ = (ख़)

ک (क) اور ق = (क़)

اگر پروف ریڈر اُردو کے تلفظ سے ناواقف ہے تو وہ ہندی حروف کے نیچے دیئے ہوئے نقطوں پر خصوصی توجہ نہیں دے سکتا اور نتیجے میں۔ ظالم کو جالم، غضب کو گجب۔ فرق کو پھرک۔ خبر کو کھبر اور قمر کو کمر، قارئین پڑھنے پر مجبور ہیں۔ صرف ہندی جاننے والے قارئین کے ذہنوں میں یہی رچ جائے گا۔ یہ نقص ہندی مجموعوں میں عام طور پر ملتا ہے۔

"ژ" جن الفاظ میں شامل ہے ان کی ادائگی کا ہندی میں کوئی اہتمام نہیں ہے۔ مثلاً ژند۔ مژگاں واژگوں۔ ژرف۔ ژولیدہ وغیرہ۔

واوٗ عطف کے لئے ہندی میں تین علامتیں مستعمل ہیں :-

۱- व ۲- ओ ۳- ◌े جیسے

بلبل و بہار = बुलबुल व बहार

مینا و جام = मीनाओ जाम

جام و مینا = जामो मीना

لیکن شعر میں یہ سب صورتیں ناقص ہیں (۱) کا شعر میں سوال ہی نہیں۔ (۲) میں "میناؤ" بن جاتا ہے، اور اس سے تلفظ کی خرابی کے ساتھ مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔ (۳) میں یہ خرابی ہے کہ "و" (جام) کے ساتھ مل کر ایک مستقل لفظ (جامو) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی ضمن میں "زاہد و شیخ" کو لیجئے یہاں مذکورہ کوئی علامت کام نہیں آسکتی۔ بلکہ ज़ाहिद् शेख़ لکھا جائے گا۔ اور یہ امتیاز ہندی جاننے والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

ہندی میں "زیر" کے لئے ि نشان ہے۔ مثلاً جیسے "रिवाज = رواج - जिस" - لیکن ترکیبی صورت میں مذکورہ نشان کام نہیں دیتا جیسے رواجِ عام = रिवाजे आम ہو جائے گا۔

بہارِ تمام = बहारे तमाम اس میں "ر" کا زیر ے کے ساتھ لکھیں گے۔

"ے" اور زیر کا باریک فرق درج ذیل مصرعوں میں خاص طور پر قابل غور ہے

"خونِ انجم میں جب شامل خونِ تمنا ہوتا ہے"

خونِ انجم = میں "ے" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ख़ूने اس لئے یہاں ے کی علامت مستعمل ہوگی۔ برخلاف اس کے خونِ تمنا = میں ے نہیں لکھیں گے۔ بلکہ چھوٹی (ि) کی ماترا لکھی جائے گی۔ اسی طرح یہ مصرع

"رنگِ حیا میں ڈوبے عارض پر یوں زلفیں بکھری ہیں"

یہاں ے علامت بیکار ثابت ہوتی ہے چونکہ (رنگے) रंगे ہو جاتا ہے اور مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی چھوٹی (ि) کی ماترا لکھی جائے گی۔ اب اس مصرع کو ملاحظہ فرمایئے۔

"پھولوں کے ساتھ اجل کے پیام بھی آئے"

یہاں کے = के لکھنے سے مصرع بحر سے خارج ہو جائیگا اس لئے یہاں بھی چھوٹی (ि) کی ماترا ہوگی۔ (कि)

اُردو میں میرے، میری کے علاوہ شعر میں مِرے اور مِری بھی مستعمل ہے۔ ہندی میں (م) مکسور والے الفاظ نہیں لکھے جا سکتے۔ بلکہ دونوں صورتوں میں میرے = मेरे یا میری = मेरी لکھا جاتا ہے لیکن اس صورت میں بعض مقامات پر شعر خارج از بحر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

"میرے محبوب اگر میری زندگی چاہیے"

یہاں میرے (م مکسور) کو ہندی میں میرے मेरे ہی لکھتے ہیں۔ اور مصرع میں میرے کی بجائے میرے لکھ دیا جائے تو مصرع خارج از بحر ہو جائے گا۔

ایک اور ٹیڑھا مسئلہ "یہ" کا ہے۔ یہ = यह جیسے

"یہ کس نے صدا دی در ہستی پہ اجل سے"

یہاں یہ = यह لکھا جائے گا۔ لیکن

"یہ تم سے کون کہتا ہے ملاقاتیں نہیں اچھی"

اس جگہ یہ = यि لکھا جائے گا۔

بحروں کی ان باریکیوں کو سمجھنا ہندی پروف ریڈر یا غیر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ مصرع خصوصی توجہ کا محتاج ہے:

"دیوانہ بڑی شان سے دیوانہ ہوا ہے"

یہاں دونوں جگہ (دیوانہ) کی "ہ" گرنا فصیح ہے اور "ن" پر حرکت (زبر) کام دیتی ہے۔ ہندی میں دیوانہ = दीवाना لکھا جاتا ہے۔ اور نتیجہ میں مصرع خارج از بحر قرار دیا جائے گا۔

اس طرح کے مصرعوں کی ہندی میں اظہار کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ہندی والے اس طرح کے مصرع کو صحیح وزن کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔

اور کو شعر میں اَر کے وزن پر بھی لکھا جاتا ہے مثلاً "جنوں میں اور خرد میں درحقیقت فرق ہے اتنا" یہاں اَوَر = अर लکھنا چاہیے مگر ہندی میں और رائج ہے وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھتے۔ اور بحر اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس فرق کو سمجھنا ہندی پروف ریڈر کے بس کی بات نہیں ہے۔

اسی طرح رعنائی شیراز ۰ کوتاہی پرواز جیسی جذبات کو درست انداز میں لکھنا سخت دشوار ہے، جس کے لئے بحروں سے واقفیت ضروری ہے۔

بہت ایسے الفاظ ہیں جن کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف مستقل غیر متحرک آتے ہیں۔ جیسے شمع۔ صبح۔ شعر وغیرہ ان کو ہندی میں صحیح لکھنا ممکن نہیں۔ ایک اور عجیب لفظ "جنبش" ہے۔ جنبش = जिम्बश

ہندی میں اس کی آواز بدل گئی۔ اگر ہندی سے اردو میں کسی ناواقف شخص نے لکھا تو وہ اس کو "جمبش" لکھے گا اور اس لفظ کی اصلی صورت مسخ ہو جائے گی۔

اس صورت میں ہندی میں منتقل کیا گیا اُردو شعری سرمایہ تباہ ہو رہا ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ اس طرف مناسب توجہ کی جائے۔ انجمن ترقی اُردو۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اور ایسے ہی مستند ادارے مل جل کر کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں۔ شہر دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یہاں شمع۔ بیسویں صدی۔ سرِیتا وغیرہ ہندی ایڈیشن بھی نکالتے ہیں۔ ان کے یہاں تنظیم بھی ہے اور وسائل بھی۔ ان پرچوں کے مالکان اور مدیران کی توجہ سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

ملک کی ادبی انجمنوں۔ ماہناموں۔ اداروں اور پبلشرز کی خدمت میں ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ اس مسئلے پر غور کرکے کسی مفید اقدام کا فیصلہ کریں۔ اُردو ادب کی یہ بھی ایک ضروری خدمت ہے۔

(سیفی پریمی)

بیجاپور (دکن) میں اُردو

بیجاپور عادل شاہیوں کا پایۂ تخت رہ چکا ہے یہاں اُردو کی بڑی سرپرستی ہوئی۔ خود ابراہیم عادل شاہ ثانی شاعر تھا اور بیجاپور کا آٹھواں سلطان عادل شاہ ثانی بھی شاعر تھا جس کا کلام "کلیاتِ شاہی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس سرزمین پر بھی ملا نصرتی، امین الدین اعلیٰ، ملا ظہوری، شاہ میراں جی اور عبد الرزاق بیجاپوری جیسے صاحب دیوان شاعر و ادیب پیدا ہوئے ہیں۔

زمانے کی ناموافقت نے اور جنگ زیب کے حملے کے بعد کامل دو سو سال تک اس سرزمین کو گمنامی میں رکھا جس سرزمین پر عادل شاہیوں کی سرپرستی میں نورس پور کی ادب نواز محفلیں صبح و شام گرم رہتی تھیں اسی میں زمانہ دراز تک اُردو میں صحیح بات چیت کرنے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کو لوگ ترستے رہے۔

اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اہل بیجاپور نے ۱۹۴۲ء میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ہاتھوں سے بیجاپور میں ایک اُردو ہائی اسکول کا افتتاح کرایا۔ چند مخلص حضرات کی مخلصانہ جد و جہد سے آج اُردو ہائی اسکول بام اوج پر پہنچ چکا ہے اور اس کی ترقی کا سہرا جناب سید صاحب جی صاحب پیرزادے مرحوم اور جناب سید شاہ مصطفیٰ حسینی ہاشمی پیر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے سر ہے۔ اس ہائی اسکول کے پہلے مدرس کی حیثیت سے جناب حبیب الدین صاحب بخشی اور ان کے ساتھیوں کی خدمات کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس ہائی اسکول کو چلانے والی انجمن

اسلام کمیٹی کے تحت آج بہت سے اُردو پرائمری مدرسے چل رہے ہیں اور حال ہی میں ایک زنانہ اُردو ہائی اسکول کا اجرا بھی عمل میں آیا ہے۔ اس طرح آج بیس سال گزر جانے کے بعد اس ضلع کے تعلقہ جات میں بھی مزید چار مندرجۂ ذیل اُردو ہائی اسکولس جاری ہیں۔

(۱) جون ۱۹۵۵ء میں باگلکوٹ میں جناب حشمت بیگ جلکھنڈی صاحب اور معین الدین زرتار گر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں ایک انجمن اُردو ہائی اسکول قائم ہوا۔ اس میں مواضعات کے غریب اُردو طلبہ کے لئے مفت کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ تعلیم دی جا رہی ہے۔

(۲) تعلقہ جلکھنڈی ۱۹۵۹ء میں جناب مرزا نصیر الدین بیگ مغل اور جناب عبد الوہاب صاحب عندلیب ایم۔ اے۔ بی ایڈ کی کوششوں سے ایک اُردو ہائی اسکول اور مولانا آزاد لائبریری کا قیام عمل میں آیا جو روز افزوں ترقی کے ساتھ علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

(۳) جون ۱۹۶۲ء کو تعلقہ مُدے بہال میں جناب قاضی سید سراج الدین صاحب تالیکوٹی، سابق صدر انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ بیجاپور کی انتھک کوشش سے ایک انجمن ہائی اسکول قائم ہوا۔ اس ہائی اسکول میں قرب وجوار کے اُردو داں غریب طلبہ کو مفت کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ تعلیم دی جا رہی ہے۔

(۴) اسی سال تعلقہ انڈی میں بھی جناب عبد الحمید ہلسگی پٹیل اور ان کے مخلص ساتھیوں کی کوشش سے ایک اُردو ہائی اسکول کا اجرا عمل میں آیا ہے۔ وہاں کے اُردو دوست اُردو کی ترقی میں انکا ساتھ دے رہے ہیں۔

اسی طرح انجمن اسلام بیجاپور کے تحت ڈیڑھ سو سے زائد اُردو پرائمری مدرسے اور دو ہائی اسکول اور ڈسٹرکٹ اسکول بیجاپور کے تحت ساڑھے تین سو کے قریب اُردو پرائمری مدرسے گویا کل پانچ سو کے قریب اُردو پرائمری مدرسے اور چھ ثانوی اسکول کام کر رہے ہیں۔ (عبد الواحد بیلف)

خاش وخماش پر غالب کی تقریظ

تقریباً ایک صدی پہلے نیلور میں ایک خاندان بیجاپور سے آکر آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد حافظ محمد علی کو مصطفےٰ علی خان بہادر نواب ادگیر نے بیجاپور سے طلب کیا اور اپنے ہاں منصب دیوانی پر فائز کیا تھا۔ حافظ محمد علی کے خاندان نے نیلور کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور یہاں اپنے علم وادب کا دریا بہایا تھا۔ اس خاندان سے متعلق ایک فرد محمد حبیب اللہ صاحب ذکا جو کہ سنہ ۱۲۸۰ھ میں حیدرآباد جا کر خدمات لائقہ پہ مامور ہوئے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور حیدرآباد میں سرآمد شعرا مانے گئے تھے۔ سُنا گیا ہے وہ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد تھے اور انھوں نے نظم ونثر پر مشتمل ایک مجموعہ "خاش وخماش" شائع کیا تھا جس کی تقریظ غالب نے لکھی تھی۔ یہ بھی سُنا گیا ہے کہ ان کی مختصر سوانح "تذکرہ گلزار اعظم" تالیف والاجاہ نواب محمد غوث خاں بہادر اور "تاریخ النوایط" مؤلفہ شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر ولا میں مذکور ہے۔

نیلور ایک ایسا مقام ہے جہاں بقول جناب احسن مارہروی "فصیح اور صحیح اُردو کا جاننا اور بولنا ضروری نہیں ہے" اور نہ جہاں کوئی ایسا کتب خانہ ہے جس میں مجھے ان معلومات کے حاصل کرنے کی کتابیں میسر آتی ہیں۔ اس لئے میں اہل علم وادب حضرات سے عموماً اور جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی اور جناب امتیاز علی عرشی صاحب سے خصوصاً ملتمس ہوں کہ وہ اس سلسلے میں مدد کریں اور غالب سے متعلق اس تقریظ سے مجھے واقفیت بہم پہنچائیں جو کہ انہوں نے خاش وخماش پر لکھی تھی۔ (عبد الوہاب تسنیم بارہ دری)

خان

ہماری زبان میں یہ بحث پڑھ کر کہ سید احمد خاں کے نام میں "خان" کہاں سے آیا، عرض کرتا ہوں کہ اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کی سفارش پر ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی نے انھیں "جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" خطاب دیا تھا۔ کثرتِ استعمال سے "جواد الدولہ" اور "عارف جنگ" ساقط ہو گئے اور "خان" باقی رہ گیا۔ چنانچہ غالب نے بھی تقریظ آئین اکبری میں ع

سید احمد خان عارف جنگ را

لکھا ہے۔ خطاب کے سلسلے میں حیات جاوید کا صفحہ ۴۲ ملاحظہ ہو۔ (عرشی)

صدر انجمن کی حیدرآباد میں تقریر

حیدرآباد ۶ر اپریل - مرکزی انجمن ترقی اردو کے صدر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے آج شام اردو ہال میں ایک خیر مقدمی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر مسرت و اطمینان کا اظہار کیا کہ حکومت آندھرا پردیش نے ریاست میں اردو کو تلگو کے مساوی درجہ دینے کا معقول فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں یہ جان کر دوگنی خوشی ہوئی کہ سابق چیف منسٹر سنجیوا ریڈی کے اس فیصلے پر موجودہ حکومت بھی کاربند ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بے حد مسرت ہوگی اگر دوسری ہندوستانی ریاستیں بھی حکومت آندھرا پردیش کے اس فیصلے اور طریقۂ کار پر عمل کریں۔ پنڈت کنزرو نے کہا جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انہیں اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی تمام سہولتیں دی جانی چاہییں۔ انجمن ترقی اردو اسی کے لئے کوشاں ہے اور اسی کی مساعی کی بنا پر اتر پردیش کے محکمۂ تعلیمات نے تمام مدارس کے نام ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ طلبہ کے سرپرستوں سے معلوم کریں کہ وہ اپنے بچوں کو کس زبان میں پرائمری تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ اتر پردیش کے محکمۂ تعلیمات نے ہیڈ ماسٹرس کو تاکید کی ہے کہ وہ ان بچوں کے لئے جو اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اردو میں تعلیم کا انتظام کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عاید کی گئی ہے کہ اردو کے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے۔ پنڈت کنزرو نے کہا کہ یہ شرط نامناسب اور غیر معقول ہے۔ اسے ختم کرنے کے لئے وزیر اعظم نہرو اور حکومت اتر پردیش سے متعدد مرتبہ نمائندگی کی گئی ہے لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ البتہ حال ہی میں ریاستی وزیر تعلیم کی اپنی وزارت سے متعلقہ رقمی مطالبات پر اسمبلی میں جوابی تقریر کا جو متن اخبارات میں شایع ہوا ہے اس کی رو سے انہوں نے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر اردو کے ۵ طلبہ بھی ہوں تو ان کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اس تیقن کے باوجود معلوم ہوا ہے کہ اردو اسٹاف میں اضافہ پر عاید کردہ تحدید برخاست نہیں کی گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس سلسلے میں اپنی مہم جاری رکھی ہے وہ اس شرط کو برخاست کر دینے کا مسلسل مطالبہ کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتر پردیش کے علاوہ ہندوستان کی ہر ریاست میں انجمن اردو بولنے والوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی امکانی کوشش کر رہی ہے۔ پنڈت کنزرو نے اس تجویز کی تائید کی کہ جب تک سارے ہندوستان میں قومی زبان رائج نہ ہو جائے اس وقت تک انگریزی کو باقی رکھا جانا چاہئے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ عصر حاضر کی سائنسی اور فنی ترقیات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اور ملک کی ترقی کے لئے انگریزی پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ پنڈت کنزرو نے کہا کہ اردو کالج ہو یا علاقائی زبان کی کوئی اور درس گاہ، طلبہ کو بہر حال انگریزی پڑھائی جانی چاہئے۔ اپنی تقریر کے آخر میں پنڈت کنزرو نے توقع ظاہر کی کہ حکومت ہند اردو کو ناانصافی کا شکار نہ بننے دے گی۔ انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم نہرو اردو اور ہندی کے روایتی جھگڑے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان کے اس رجحان کے باوجود اس بے بنیاد جھگڑے کے خاتمے کے لئے سازگار ماحول نہیں پیدا کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران یہ سوال اٹھایا کہ آل انڈیا ریڈیو کا ہندی پروگرام آخر ہندوستانی عوام کے کس طبقے کے لئے نشر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ پروگرام ہندی بولنے والے عوام کے لئے نشر کیا جاتا ہے تو اس کی زبان ایسی ہونی چاہئے کہ عام آدمی اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ پنڈت کنزرو نے اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ آل انڈیا ریڈیو کے ارباب مجاز اس حقیقت کو نظر انداز کر کے ہندی پروگرام ایسی زبان میں نشر کرتے ہیں جو اچھی خاصی ہندی جاننے والوں کو بھی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ انہوں نے اخبارات کی زبان کو بھی سہل بنانے پر زور دیا اور کہا کہ ریڈیو اور اخبارات عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں، انہیں سہل زبان استعمال کرنا چاہئے تاکہ عوام سمجھ سکیں۔

بھارت نیوز کے مطابق اس سے قبل نواب میر احمد علی خاں وزیر اعلا صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے پنڈت کنزرو کی گلپوشی کی۔ مولوی حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں انجمن کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اردو ہال، اردو کالج اور اردو آرٹس کالج کے تعلق سے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ تعلیم کی جانب انجمن اپنی توجہ مرکوز کر رہی ہے۔ گزشتہ سال کے دوران اردو کی جماعتوں، مدارس وغیرہ کے قیام کے لئے ایک سو نمائندگیاں کی گئیں جن میں ۳۵ کامیاب رہیں اور ۵۰ زیر دوران ہیں۔ (سیاست حیدرآباد)

شاخ کھنہ منڈی کا چناؤ

۱۰ مارچ کو کھنہ منڈی ضلع [illegible] میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا چناؤ بہ صدارت بابو رام گوپال [illegible] ہوا جس میں حسب ذیل عہدہ دار چنے گئے: صدر مہاشہ پریم پرشاد متل شاد، نائب صدر [illegible] گنپت سنگھ [illegible]، جنرل سکریٹری ٹھاکر چند لال [illegible]، جوائنٹ سکریٹری رام بھگت متل، خزانچی بابو رام [illegible]۔

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ دیوان مہندر کمار صاحب اور بابو بشن لال متل صاحب مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

ایک پرستاؤ کے ذریعہ پنجاب سرکار سے مانگ کی گئی کہ ہم اردو کی پنجاب میں پھر وہی پوزیشن چاہتے ہیں جو کہ آزادی سے پہلے تھی۔

(مہاشہ پریم پرشاد متل شاد صدر شاخ کھنہ منڈی)

از ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

اسلام نامہ از مسلم الحریری

ناشر: انجمن اسلام نامہ۔ سدانند بازار۔ بنارس
قیمت۔ پانچ روپے

یہ اسلام نامہ (جس کا دوسرا نام آثار اہم ہے) کی جلد اول ہے جس میں حضرت آدمؑ کی تخلیق سے لے کر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ورود مدینہ تک کے حالات مثنوی کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ اتفاق سے اسی بحث پر شاہنامۂ اسلام مصنفہ حفیظ جالندھری، شہنشاہ نامۂ اسلام از محشر بدایونی اور جنگ نامۂ اسلام از منظور پہلے سے موجود ہیں۔ اگر مختلف اصحاب تاریخ اسلام کے مختلف حصے لے لیتے تو توارد کی صورت پیدا نہ ہوتی۔ بہرحال مصنف اپنی اس کوشش پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہیں کہیں ضرورت شعری کی وجہ سے بعض وہ الفاظ و تراکیب نظر پڑیں جو درست نہیں ہیں مثلاً طیارے (بغیر تشدید۔ صفحہ ۱۵)۔ معنون بروزن مضمون (ص ۹۸)۔ آل قریشی (ص ۱۱۳)، ظلم و بیدادی (ص ۱۴۹) خبّاب بن الارتؓ (ص ۱۴۹)، بنو غفّار (ص ۱۷۷)۔ اسی طرح بعض جگہ "موجودات و مخلوقات" وغیرہ قوافی استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی نظم میں ایسی کمزوریاں ناگزیر ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ نظم مذکور مجموعی طور پر صحت عقیدہ، صحت واقعات اور صحت فن کا عمدہ نمونہ ہے۔ واقعات کی پابندی کے ساتھ سلاست اور روانی لائق تحسین ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے حالات میں مصنف نے عصمت انبیاءؑ پر بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اور درایت کو روایت پر ترجیح دی ہے۔

گلِ خنداں سید الشہداء نمبر

مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ گل خنداں کشمیری بازار لاہور
قیمت۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

ماہنامہ گل خنداں لاہور سے نکلتا ہے۔ یہ اس کا سید الشہداء نمبر ہے جس میں شہادت سیدنا امام حسینؓ سے متعلق ذی علم اہل قلم کے مقالات جمع کر دئے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں مولانا علم الدین سالک۔ ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن کامونپوری۔ پروفیسر سید احتشام حسین۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی جیسے ممتاز اصحاب ہیں۔ نظمیں بھی بیشتر معیاری ہیں۔ غرض یزید کی ولی عہدی سے لے کر اہل بیتؓ کرام کی واپسی مدینہ تک کے تمام واقعات مجمل مگر مدلل انداز میں زیر بحث آ گئے ہیں۔

اگر تاریخ اسلام کو گہری غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو ہر شخص اس نتیجے پر پہنچے گا کہ نام نہاد "خلفائے" بنی امیہ کا عہد حکومت سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کتنا ہی بلند سہی۔ مگر اسلامی اقدار کے اعتبار سے نہایت پستی کا دور تھا۔ قبائلی عصبیت۔ عدم مساوات غیر شرعی رہن سہن اور طرز حکمرانی۔ تشدد پسند موروثی حکومت اور اسی قسم کی بہت سی خرابیاں معاشرے اور نظام سلطنت میں داخل ہو گئی تھیں۔ اور ایسے حالات میں رسولؐ کی تعلیمات کو از سر نو قائم کرنے کے لئے رسولؐ ہی کی آغوش تربیت کا پالا ہوا زعیم حریت کھڑا ہو سکتا تھا۔ خواہ اس کو اس کار عظیم کے واسطے عظیم سے عظیم قربانی دینا پڑے۔ خود امامؑ نے فرمایا تھا کہ "ان حکام نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے۔ خدا کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔ فساد کو ظاہر۔ حدود شرع کو معطل۔ غنیمت کو غصب، حرام کو حلال۔ حلال کو حرام کر رکھا ہے۔ ان پر اعتراض کرنے کا سب سے زیادہ مجھے حق ہے"۔ یہ دراصل ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تردید کی جرأت یزید کے حامیوں کو نہ جب ہو سکی نہ اب۔ اور حق و باطل کی یہی جنگ تھی جو ارض کربلا میں لڑی گئی۔

امید ہے کہ اہل ذوق گل خنداں اور خصوصاً اس خاص نمبر کی ہر طرح قدردانی کریں گے۔ اس کا افسوس ہے کہ اس نمبر میں طباعت کی اغلاط بکثرت ہیں۔

ریاستی شاخ راجستھان کا تعزیتی جلسہ

ریاستی شاخ انجمن ترقی اردو راجستھان جناب محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے سانحۂ وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی علمی۔ ادبی۔ ثقافتی اور لسانی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو راحت و آسائش دائمی سے نوازے اور جوار رحمت میں جگہ دے نیز انجمن ترقی اردو ریاست بہار اور مرحوم کے پس ماندگان سے اظہار تعزیت کرتی ہے۔

(احترام الدین احمد شاغل جنرل سکریٹری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذر رحمن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا۔